مسلمانوں اوراہل روم کی ایک تیسرے فریق کے خلاف مشترکہ جنگ؟

حضرت امام مہدی کون، خلیفہءاول دوم یا سوم؟

www.hamditabligh.net

مسلمانوں اوراہل روم کی ایک تیسرے فریق کے خلاف مشترکہ جنگ؟

محمد نذیر یٰسین (naziryaseen@yahoo.com)

زیرنظر مضمون نبی کریم ﷺ کی کچھ احادیث کے متعلق ہے جن میں ایک تیسرے فریق کے خلاف مسلمانوں اوراہل روم کی مشترکہ معرکہ آرائی اوراسکے بعد پیش آنے والے حالات کی خبر دی گئی ہے۔
ان احادیث مبارکہ کے متعلق کئی نامور حضرات خیال آرائی کر چکے ہیں۔ کچھ کے نزدیک یہ واقعہ پیش آچکا ہے جبکہ کچھ ابھی تک اسکے ظہور کے قائل نہیں ہیں۔ جو حضرات اس کو مستقبل کا ایک واقعہ قرار دیتے ہیں، وہ یہ دُور کی کوڑی لاتے ہیں کہ مستقبل میں دو بڑے اشترا کی ممالک، روس اور چین کا اتحاد قائم ہوجائے گا، پھرانکی امریکہ اور یورپ کے ساتھ ایک ایسی ہولناک وتباہ کن عالمگیر جنگ ہوگی کہ اس کے نتیجہ میں دنیا کی دوتہائی آبادی ہلاک ہونے کے علاوہ اس خطہءارضی سے تمام جدید ٹیکنالوجی اور ذرائع توانائی کا بھی خاتمہ ہوجائے گالہذا اسکے بعد ہونے والی جنگیں زمانہءقدیم کے ہتھیاروں سے ہی لڑی جا سکیں گی۔ راقم کے خیال میں ایسے نقطہ ہائے نظر کو پھیلانے کا مقصد اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ امت مسلمہ کو اا **اعدو لهم ما استعطم** اا کے قرآنی حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے جدید ترین جنگی ہتھیاروں کے حصول وتیاری سے باز رکھا جا سکے۔
جو حضرات اس واقعہ کے پیش آچکنے کے قائل ہیں، اُن کی آراء میں بھی باہم اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد افغانستان میں روس کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ہے تو بعض اسے ۱۹۹۱ء میں عراق کی بعثی حکومت کے خلاف اہل عرب اوراہل غرب کی مشترکہ جنگ پر منطبق کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں اُن کا یہ نقطہءنظر خاصا کمزور اور بعض اعتبارات سے محل نظر ہے جبکہ اول الذکر نقطہءنظر خاصا قوی اور مدلل ہے اور راقم اسی کو درست خیال کرتا ہے۔ تاہم اس کے متعلق اپنے دلائل پیش کرنے سے قبل اس بارے میں وارد ہونے والی دو روایات کا متن اور ترجمہ پیش خدمت ہے:

(۱) عن ذی مخبرؓ عن النبی ﷺ قال: تصالحون الروم صلحا امنا تغزون انتم و هم عدوا من ورائهم فتسلمون و تغنمون (وتنصرون)ثم تنزلون بمرج ذی تلول فیقوم الیه رجل من الروم فیرفع الصلیب فیقول: الاغلب الصلیب، فیقوم الیه رجل من المسلمین فیقتله فعند ذلك تغدر الروم وتكون الملاحم فیجمعون الیكم ویا تونكم فی ثمانین غایة مع كل غایة عشرة آلاف۔ (رواه احمد)

اا حضرت ذی مخبرؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: عنقریب تم اوراہل روم امن کی خاطر صلح کرلوگے، پھرتم اور وہ ملکر ایک ایسے دشمن کے خلاف معرکہ آرائی کروگے جو تم دونوں کے علاوہ ہوگا (یا تم دونوں کے عقب میں ھوگا)، پس تم فتح یاب ہوگے، تمھیں مال غنیمت ملے گا اور تم سلامت ہوجاؤگے، پھراس معرکہ سے واپسی پر تم ایک بلند ٹیلوں والی چراگاہ میں ہوگے تو نصرانیوں میں سے ایک شخص صلیب بلند کرے گا اور کہے گا: صلیب غالب آگئی تو (اس کے ردعمل میں) مسلمانوں میں سے ایک شخص (غصہ میں آکر) اسے قتل کرڈالے گا، پس اس موقع پر اہل روم غداری کریں گے اور پھر خون ریز جنگیں ہوں گی، پس وہ تمھارے خلاف جمع ہوں گے اور تمھاری طرف اسی (۸۰) جھنڈوں کے ساتھ آئیں گے اور ہر جھنڈے تلے دس (۱۰) ہزار کا لشکر ہوگا۔اا

(۲) عن ذی مخبرؓ قال سمعت رسول الله ﷺ یقول: ستصالحون الروم صلحا آمنا، فتغزون انتم وهم عدوا من وراء كم ، فتنصرون وتغنمون وتسلمون ثم ترجعون حتیٰ تنزلوا بمرج ذی تلول، فیرفع رجل من اهل ا لنصرانیة الصلیب فیقول : غلب الصلیب ، فیغضب رجل من المسلمین فیدقه، فعند ذلك تغدرالروم وتجمع للملحمة۔زاد فی روایة: ویثور المسلمون الی اسلحتهم فیقتتلون فیكرم الله تلك العصابة بالشهادة۔(رواه ابو دائود)

اا حضرت ذی مخبرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا! عنقریب تم اوراہل روم امن کی خاطر صلح کرلوگے، پھرتم اور وہ ملکر ایک ایسے دشمن کے خلاف معرکہ آرائی کروگے جو تم دونوں کے علاوہ ہوگا، پس تم فتح یاب ہوگے، مال غنیمت حاصل کروگے اور تم سلامت ہوجاؤگے، پھراس معرکہ سے واپسی پر تم ایک بلند ٹیلوں والی چراگاہ میں ہوگے تو عیسائیوں میں سے ایک شخص صلیب بلند کرے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آگئی، اس پر ایک مسلمان غضبناک ہوکر اسے دھکا دے دے گا تو اس موقع پر اہل روم تم سے غداری کریں گے اور خونریز جنگ کے لئے جمع ہوجائیں گے۔ ایک اور روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ مسلمان اپنے اسلحہ کی طرف لپکیں گے اور جنگ کریں گے، پس اللہ تعالیٰ اس جماعت کو شہادت کی عزت سے نوازدے گا۔اا
بطور نمونہ تحریر کی گئیں، درج بالا دونوں روایات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی اہل روم سے صلح، ایک تیسرے فریق کے خلاف جنگ اور اس میں فتح وکامرانی تک تو کوئی اختلاف نہیں البتہ ایک عیسائی کے صلیب اٹھا کر اظہار تفاخر کرنے اور اس پر ایک مسلمان کی طرف سے ردعمل ظاہر کرنے سے لیکر آخر تک دونوں روایات میں تعارض پایا جاتا ہے۔ ان روایات کی حقیقت اور ان کے باہمی تعارض کو دور کرنے کے لیے ہمیں درج ذیل نکات کو سمجھنا ہوگا:

(ا) صلح ہمیشہ دو متحارب فریقوں کے مابین ہوتی ہے اور صلحنامہ کی شرائط خواہ کتنی ہی منصفانہ قرار دی جائیں، صلحنامے میں ایک فریق کو دوسرے پر بہرکیف برتری حاصل ہوتی ہے۔ صلح نامے کی ایک اہم خصوصیت تو یہ ہوتی ہے کہ دونوں متحارب فریق ایک دوسرے کے جداگانہ تشخص کو تسلیم کر لیتے ہیں تاہم مستقبل کے حوالہ سے صلح نامہ کا یہ معاہدہ ایک فریق کے لئے پیغام شکست جبکہ دوسرے کے لیے پیغام فتح

ہوتا ہے اگرچہ دونوں فریق اپنی اپنی وقتی مصلحتوں کو مدنظر رکھ کر ہی صلح پر آمادہ ہوتے ہیں۔ تاریخ اسلام کی مشہور ترین صلح حدیبیہ کی مثال کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے بظاہر دب کر صلح کی تھی حالانکہ قرآن حکیم اسی صلح کو فتح مبیں قرار دیتا ہے۔ اس کی توجیہہ دو ہی باتوں سے ہوسکتی ہے: اول یہ کہ اپنے آپ کو مضبوط بنانے کیلئے مسلمانوں کو مزید مہلت درکار تھی اور دوم یہ کہ کفار پر اتمام حجت کرنا مقصود تھا کہ صلح نامے کے بندھن کے ذریعے کفار مکہ کی بدعہدی اور ان کے نام نہاد دین وایمان کی قلعی کھولنا مقصود تھا وگرنہ دین اسلام تو دوسرے تمام ادیان پر غالب ہونے کے لئے ہی آیا ہے جیسا کہ متعدد نصوص قرآنی سے ثابت ہوتا ہے۔

اس تناظر میں ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ان روایات میں مسلمانوں اور اہل روم کے مابین جس صلح کا ذکر ہے، اس کا تعلق مسلمانوں کے دور مغلوبیت سے ہے جب اہل روم غالب ہوں گے اور مسلمانوں کو کسی خاص مصلحت کے تحت اہل روم کے ساتھ صلح پر مجبور ہونا پڑے گا اور یہ مصلحت یقیناً وہی ہے جس کا ذکر روایات میں آیا ہے یعنی ایک تیسرے دشمن سے محفوظ رہنے کیلئے اہل روم کے تعاون وامداد کی ضرورت۔ یہی معاملہ اہل روم کا ہوگا کہ وہ اپنی بعض مصلحتوں کے تحت مسلمانوں کے ساتھ صلح پر مجبور ہوں گے۔ درحقیقت یہ مسلمانوں کا وہی دور مغلوبیت ہوگا جسے ایک روایت میں غلامی والی ملوکیت کے دور کا نام دیا گیا ہے کہ جب امت مسلمہ اپنے زوال کی انتہائی حد کو پہنچ کر دوسروں کے تعاون وامداد کی محتاج ہو چکی ہوگی۔

(۲) راقم کے خیال میں ان روایات کی مخاطب عمومی طور پر پوری اُمت ہے نہ کہ اس کا کوئی مخصوص گروہ جیسا کہ بعض حضرات کے خیال میں یہاں مخاطب صرف اہل عرب ہیں اور اسی بناء پر وہ کویت کی آزادی کیلئے ۱۹۹۱ء میں مغربی افواج اور چند عرب ممالک کی طرف سے عراق کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کو اسکا مصداق قرار دیتے ہیں۔ راقم کے خیال میں یہ نقطہ نظر انتہائی کمزور ہے اور بہت سی پیچیدگیوں و سوالات کو جنم دینے کا باعث بنا ہے۔ صلح کے متعلق پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ دو متحارب فریقوں کے مابین ہوتی ہے۔ اگر یہاں مخاطب صرف اہل عرب ہی ہوں اور اس صلح کا مصداق بھی اہل عرب اور اہل مغرب کا عراق کے خلاف مشترکہ کاروائی کرنا ہی قرار پائے تو کیا اس صلح سے قبل اہل عرب اور اہل صلیب باہم ایک دوسرے کے خلاف مصروف پیکار تھے؟ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون جاری رکھتے ہوئے ایک طرف تو جہاد افغانستان میں سرخ روسی سامراج کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف ایران کے خلاف جنگ میں عراق کی مدد کر رہے تھے۔ مزید برآں روایات میں اس صلح کو ایک تیسرے دشمن سے حفاظت، سلامتی اور مال غنیمت کے حصول کا باعث قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ اس صلح کیلئے مذمت یا ناپسندیدگی کا کوئی قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔ کیا عربوں اور مغربی اتحادیوں کی عراق کے خلاف جنگ سے مذکورہ بالا فوائد میں سے ایک بھی حاصل ہوا تھا؟ اور کیا عراق (جو خود بھی عرب کا ہی حصہ ہے) چند عرب ممالک کے لئے واقعتاً اتنا بڑا خطرہ تھا کہ اس کی خاطر احکام شریعت کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے غیر مسلم افواج کو جزیرۃ العرب کی مقدس سرزمیں میں داخلے کی اجازت دے دی جاتی؟ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اہل عرب کے اس انتہائی خلاف شریعت اقدام کے متعلق آنحضور ﷺ ناپسندیدگی کا ذرا سا اظہار بھی نہ فرماتے جبکہ آپ ﷺ کا معمول ایسا ہرگز نہیں تھا جیسا کہ اکثر وبیشتر دیگر روایات سے یہ حقیقت بخوبی معلوم ہوتی ہے۔

پس راقم کے خیال میں اقرب الی الصواب یہی بات ہے کہ ان روایات کی مخاطب بحیثیت مجموعی امت مسلمہ ہی قرار پائے۔

(۳) روایات میں ایک تیسرے فریق کے خلاف جنگ کیلئے تو غزوہ کا لفظ وارد ہوا ہے جبکہ صلح ٹوٹنے کے بعد مسلمانوں اور اہل روم کے مابین ہونے والی جنگوں کے لئے ملحمۃ یا الملاحم کے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔ غزوہ کا مطلب معرکہ یا مہم ہے جس میں جنگ کا ہونا بھی لازم نہیں جیسا کہ غزوہ تبوک کے حوالہ سے ہم جانتے ہیں کہ اس میں جنگ کی نوبت ہی نہ آئی تھی جبکہ ملحمۃ کا مطلب گوشت کے چیتھڑے اڑانے والی یعنی بہت زیادہ خونریزی اور ہلاکت وبربادی کا باعث بننے والی جنگ ہے۔ اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھیں تو دور حاضر کی دو جنگی اصطلاحات سرد جنگ (Cold War) اور گرم جنگ (Hot War) کو بالترتیب غزوہ اور ملحمۃ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لہذا ان روایات کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے غزوہ اور ملحمۃ کے فرق کو مدنظر رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس فرق کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے ہی بعض حضرات ایک تیسرے فریق کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کو مستقبل کی ایک ہولناک عالمگیر جنگ قرار دیتے ہیں حالانکہ روایت میں غزوہ کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے ہیں۔

(۴) ان روایات میں جنگ کے بعد رونما ہونے والے واقعہ (یعنی ایک عیسائی کا صلیب بلند کرنا اور اسکے غالب آجانے کا اعلان کرنا) فی الحقیقت ایک واقعہ ہے یا پھر حقیقت احوال کو سمجھانے کے لیئے محض ایک تمثیل؟ راقم نے جہاں تک اس پر غور کیا ہے تو اسے ایک تمثیل قرار دیے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا جس کی وجہ یہ ہے کہ

موجودہ دور تو سیکولرازم کا دور کہلاتا ہے جس میں محض مذہب کے نام پر جنگ کرنا ہی معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اہل اسلام اور اہل مغرب کے مابین جاری موجودہ آویزش اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے تو مذہبی تعصّبات کی بناء پر ہی ہے تاہم اس حقیقت کو کھلے عام تسلیم نہیں کیا جاتا جس کی ایک وجہ تو راقم کے خیال میں یہ ہے کہ ایسا کرنے سے اہل مغرب کے نام نہاد تصور سیکولرازم کی نفی ہوتی ہے جبکہ دوسری وجہ یہ ہے کہ کھلم کھلا مذہب کا نام استعمال کرنا انکے مفاد میں بھی نہیں ہے کہ اس کا مطلب تو پورے عالم اسلام کو عیسائی قوتوں کے خلاف متحد ہونے کا موقع فراہم کرنا ہوگا اور عالم اسلام کا متحد ہو جانا ہی ان سازشی اقوام کے لیے پیغام شکست سے کم نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ہی تو مغربی قوتوں نے ایک طویل عرصہ تک سازشوں کے جال بُن بُن کر بالآخر ۱۹۲۴ء میں وحدت امت مسلمہ کی علامت یعنی ادارہ خلافت کا خاتمہ کروا دیا تھا۔

موجودہ دور میں اہل مغرب مسلمانوں کے خلاف مختلف حیلوں بہانوں وسازشوں کے ذریعے ہی جنگیں مسلط کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سرکاری سطح پر مذاہب کی جنگ تو کجا تہذیبوں کی جنگ (clash of civilizations) کی اصطلاح سے بھی گریز کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کبھی کبھار سچی بات منہ سے نکل ہی جایا کرتی ہے جس کی ایک اہم مثال صدر بش کا ۱۱ ستمبر، ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد دہشت گردوں کے خلاف صلیبی جنگوں کے آغاز کا اعلان کرنا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد ازاں سرکاری طور پر ان کے یہ الفاظ بعض اُن مصلحتوں کی وجہ سے واپس لے لئے گئے تھے جن میں سے بعض کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

راقم کی اس دلیل پر یہ ممکنہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ایسا ہونے (یعنی کھلم کھلا مذہب کا نام استعمال کئے جانے) کا امکان مستقبل میں تو موجود ہے تو اس کے جواب کیلئے اُن روایات پر غور ہی کافی ہوگا جن میں الملحمۃ العظمیٰ کے نام سے مسلمانوں اور اہل روم کے مابین ہونے والی عظیم ترین جنگ کی وجہ بھی خالصتاً مذہبی معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس کا ظاہری سبب اپنے اُن سپاہیوں کو چھڑوانا ہوگا جو غالباً مشرف بہ اسلام ہو کر مسلمانوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہوں گے جیسا کہ ایک طویل حدیث مبارکہ کے درج ذیل حصہ سے معلوم ہوتا ہے:

۱۱ پھر جب وہ (مسلمان) صف بندی کر لیں گے تو رومی ان سے کہیں گے کہ تم ہمارے اور اُن لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جنہوں نے ہمارے لوگ قیدی بنا لئے ہیں

(جوابا) مسلمان کہیں گے! اللہ کی قسم، ہم تمھارے اور اپنے بھائیوں کے درمیان سے ہرگز نہیں ہٹیں گے۔ پھر وہ اُن سے جنگ کریں گے۔۱۱ (عن ابی ھریرۃؓ رواہ مسلم)

یہاں اہل روم جنگ کا ظاہری سبب محض اپنے بھگوڑے سپاہیوں کو چھڑوانا قرار دیں گے حالانکہ یہ تمام اسباب میں سے محض ایک سبب ہوگا جبکہ اصل وجہ انکا مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مذہبی تعصب وبغض ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر معاشی وسیاسی مفادات کا تحفظ وحصول ہوگا جیسا کہ ہم خلیجی جنگ ۱۹۹۱ء، افغان جنگ ۲۰۰۱ء اور عراق پر امریکی قبضہ کے لئے ہونے والی جنگ ۲۰۰۳ء وغیرہ دیگر جنگوں کے حوالہ سے بخوبی جانتے ہیں کہ ان جنگوں کے اسباب محض وہی نہیں تھے جو بیان کئے گئے تھے۔ کیا اپنے باغی سپاہیوں کی بازیابی کا مطالبہ اور انہیں چھڑوانے کے لئے اُن کا جنگ کرنا، اہل مغرب کی طرف سے اسامہ بن لادن اور دیگر نام نہاد دہشت گردوں کو ان کے حوالہ کرنے کے مطالبہ سے ملتا جلتا نہیں ہے؟

پس راقم کے خیال میں روایات میں بیان کیا گیا واقعہ ایک تمثیل کے سوا کچھ نہیں جس کا مقصد مسلمانوں اور اہل روم کے مابین ہونے والی عارضی صلح کے ٹوٹ جانے کے عمل کو بیان کرنا ہے۔

اس حقیقت کو ایک اور انداز سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ دور مسلمانوں کی مغلوبیت کا دور ہے اور اس وقت عالم اسلام کے تقریبا تمام حکمرانوں کی حیثیت محض کٹھ پتلیوں سے زیادہ نہیں۔ ان سامراجی غلاموں سے اس بات کی توقع کیونکر کی جاسکتی ہے کہ وہ محض ایک معمولی واقعہ کی بناء پر اپنے بیرونی آقاؤں کے خلاف جنگ کے لئے آمادہ ہوجائیں گے جبکہ یہ حقیقت ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جنگ کی نوبت تب ہی آتی ہے جب دونوں فریق اپنے اپنے مؤقف پر جازم ہوکر جنگ کے لےٹل جائیں۔ ایک فون کال پر یوٹرن لینے والے ان حکمرانوں سے اس بات کی توقع تو بجا طور پر رکھی جاسکتی ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ کے ذمہ دار (یعنی صلیب بلند کرنے والے عیسائی سپاہی کو قتل کرنے والے شخص) کا کورٹ مارشل کردیا جائے یا پھر اسے گوانٹاناموبے کے جزیرے میں پہنچا کر صلیبیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے لیکن اس معمولی واقعہ کی بناء پر اپنے آقاؤں کے خلاف جنگ کا تو سوچنا بھی انکے لئے محال ہوگا۔

مذید برآں ابتداء میں بیان کی گئی دونوں روایات کے باہمی اختلاف سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ دراصل ایک تمثیل ہی ہے۔ ایک روایت میں صلیب بلند کرنے والے عیسائی کی صلیب ٹوٹنے کا بیان ہے تو دوسری میں اسکے قتل کا۔ یہ اختلاف بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا منشاء ایک مسلمان کا ردعمل بیان کرنا تھا نہ کہ ایک حقیقی واقعہ۔ غالبا اسی وجہ سے راویوں کے بیانات میں بھی اختلاف واقع ہوا ہے۔

درج بالا تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ ان روایات کی مخاطب پوری امت مسلمہ ہے اور یہ کہ ان میں بیان کیا گیا واقعہ ایک تمثیل ہے جس کا مقصد یہ حقیقت بیان کرنا ہے کہ مسلمانوں اور اہل روم کے مابین ہونے والی صلح اُن کی ایک تیسرے فریق کے خلاف ہونے والی مشترکہ جنگ میں فتح کا کریڈٹ لینے کے چکر میں ٹوٹ جائے گی۔ عیسائی اس فتح کا سبب اپنی صلیب کو قرار دیکر اپنے مذہب، تہذیب وتمدن اور سرمایہ دارانہ نظام کے غالب ہونے کا اعلان کریں گے جسے مسلمانوں کا ایک باحمیت طبقہ اسلام کی توہین سمجھتے ہوئے اسکے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار کرے گا۔ یہ ردعمل فطری طور پر جوابی ردعمل کو جنم دے گا جو اہل روم کی طرف سے مسلمانوں پر مختلف حیلوں بہانوں سے جنگیں مسلط کرنے پر منتج ہوگا جیسا کہ بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا کہ رومی چھپ چھپ کر اکٹھے ہوں گے، مسلمانوں کے خلاف سازشیں کریں گے اور دیگر اقوام کو اپنے ساتھ ملا کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گے اور اب ان کے سامنے مسلمانوں کی حیثیت محض سیلاب کے جھاگ کی سی رہ جائے گی۔

درج بالا بحث کے نتیجہ میں اُن حضرات کا نقطۂ نظر بہت حد تک وزنی اور درست معلوم ہوتا ہے جنکے خیال میں ان روایات کا مصداق افغانستان میں اشتراکی روس کے خلاف لڑی جانے وال جنگ ہے جس میں اہل مغرب نے سوشل ازم کا پھیلاؤ روکنے کی خاطر مجاہدین اسلام کی مدد کی تھی۔

مسلمانوں اور اہل روم کے مابین صلح کے عمل کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا آغاز گزشتہ صدی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی ہوگیا تھا جب دوران جنگ ہی ۱۹۱۸ء میں سوشلزم کے نظریہ کی بنیاد پر ایک بڑے ملک یعنی روس میں انقلاب برپا ہوگیا تھا۔ چونکہ یہ انقلاب مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک ردعمل تھا اور اس نے مذہب کو بھی افیون کا نام دے دیا تھا لھذا سرمایہ دارانہ نظام کی علمبردار عیسائی دنیا نے اسے اپنے لئے ایک بڑا خطرہ قرار دیتے ہوئے اسکے ممکنہ پھیلاؤ کی روک تھام کے لئے اپنے اتحادیوں کی تلاش شروع کردی تھی۔ اسی مصلحت کے پیش نظر انہوں نے خلافت عثمانیہ کے مقبوضات پر اپنا تسلط زیادہ دیر برقرار نہ رکھنے میں ہی عافیت جانی کہ مذہب کے نام پر سوشلزم کا مقابلہ کرنے کے لئے مذہب اسلام کے پیروکاروں کے علاوہ کوئی اور مضبوط اتحادی انہیں میسر نہ آسکتا تھا۔

دوسری طرف مسلم دنیا بھی اس انقلاب سے برابر کا خطرہ محسوس کررہی تھی جسکی دو بڑی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو سوشلزم کے نظریہ کا خلاف فطرت اور خلاف اسلام ہونا تھا جبکہ دوسری وجہ اشتراکی نظام کے سرخیل سوویت یونین کے توسیع پسندانہ عزائم تھے۔ وہ وسطی ایشیا کی اکثر اسلامی ریاستوں کو ہڑپ کرچکا تھا جبکہ بحیرہ عرب اور بحیرہ اسود کے گرم پانیوں تک رسائی کی شدید خواہش اسکے اندر مچل رہی تھی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ پاکستان، ایران، ترکی اور مشرق وسطی کے اکثر ممالک اسکے نشانہ پر تھے لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ یہی ممالک آپس میں متحد ہوکر سوشلزم کے خلاف محاذ آرائی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔

عرب حکمرانوں سے امریکہ ویورپ کے اچھے تعلقات ومعاہدات، عرب دنیا کو سوشلزم سے محفوظ رکھنے کیلئے اہل مغرب کی ایماء پر ۱۹۴۵ء میں عرب لیگ کا قیام، مسلمانان ہند کے الگ وطن کے مطالبہ کو تسلیم کرتے ہوئے قیام پاکستان کو ممکن بنانا اور اس طرح اس خطہ میں سوشلزم کے ممکنہ اثرات کو روک دینا، دیگر مسلم مقبوضات میں اپنے من پسند لوگوں کو بطور حکمران مقرر کرکے انہیں آزادی دے دینا، وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خاں کا روس اور امریکہ دونوں کی طرف دورہ کی دعوت کے باوجود صرف امریکہ کا دورہ کرنا اور اس طرح پاکستان کا سوشلزم کے مقابلہ میں مغربی ممالک کا ایک اہم ترین حلیف بن جانا، پچاس کی دہائی میں پاکستان سمیت دیگر کئی اہم مسلم ممالک کا سیٹو، بغداد پیکٹ اور سینٹو کے معاہدوں میں شریک ہونا وغیر، یہ سب مسلمانوں اور اہل روم کے مابین جاری صلح کے عمل کے ہی مختلف مظاہر وسنگ ہائے میل تھے جن کا اولین اور بنیادی مقصد اشتراکیت کے اثرات کو محدود کرنے کی خاطر یورپ اور امریکہ کی روس کے خلاف جاری سرد جنگ میں ہمراہی واتحادی بننا تھا۔ افغانستان پر روسی قبضہ کے موقع پر ہونے والے جہاد افغانستان کو ایک تیسرے فریق یعنی روس کے خلاف جاری سرد جنگ کا نقطۂ عروج قرار دیا جاسکتا ہے جس میں مسلمان اور اہل روم اپنے مشترکہ دشمن کو شکست دینے میں بالآخر کامیاب رہے۔

اہل اسلام اور اہل صلیب کی لامذہب اشتراکی کیمپ کے خلاف اس سرد جنگ کے لئے غزوہ کا لفظ انتہائی مناسب ہے۔ یہ جنگ اگرچہ مسلمانوں اور اہل روم نے اپنے اپنے مفادات کی خاطر لڑی تھی تاہم مسلمانوں کو اس سے بیشمار فوائد حاصل ہوئے جن میں اہل مغرب سے جدید ہتھیاروں وٹیکنالوجی کے حصول کے علاوہ بالآخر پسپا ہونے والی روسی افواج کے اسلحہ کا بطور غنیمت حاصل ہونا وغیرہ سب شمار کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کا عالم اسلام کی واحد ایٹمی قوت بن جانا بھی اس اتحادی جنگ کی آڑ میں ہی ممکن ہوسکا تھا۔

روایات میں بلند ٹیلوں والی چراگاہ کا مصداق بلاشبہ سرزمین افغانستان کو قرار دیا جاسکتا ہے جو سوشلزم کے خلاف معرکہ آرائی کا آخری میدان بھی بنی اور یہیں سے اس صلح کے ٹوٹنے کا آغاز بھی ہوا۔ صلح ٹوٹنے کے اس عمل کی ابتداء کے متعلق جو واقعہ روایات میں بیان ہوا ہے، اسکے متعلق راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ یہ ایک فرضی واقعہ ہے تاہم اس کے ایک حقیقی واقعہ ہونے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عین ممکن ہے کہ بالکل ایسا ہی یا اس سے ملتا جلتا واقعہ افغانستان کے کسی ایسے علاقہ میں وقوع پزیر ہوا ہو جہاں مجاہدین کی مدد کے لئے مغربی ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کے اہل کار موجود ہوتے تھے اور یہ کہ اس واقعہ کو بعض مصلحتوں کی وجہ سے ظاہر ہی نہ ہونے دیا گیا ہو۔

راقم کے خیال میں ان روایات میں تمثیلی انداز سے جن حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُن کا تعلق ۱۹۸۸ء میں روسی افواج کے افغانستان سے واپسی سے کچھ پہلے کے حالات سے ہے۔ یہ وہ دور تھا جب روسی افواج کی واپسی ایک نوشتہء تقدیر نظر آرہی تھی جس کا مظہر جنیوا مذاکرات کو قرار دیا جاسکتا ہے جو بالآخر جنیوا معاہدہ پر منتج ہوئے تھے۔ یہ صورت حال مجاہدین اور مغربی قوتوں کے لیے نوید فتح بن چکی تھی اور دونوں فریقوں نے اس ممکنہ فتح کا کریڈٹ لینے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ چونکہ اس جنگ میں زیادہ تر جانی و مالی قربانیاں مسلمانوں نے ہی دی تھیں لہذا فطری طور پر فتح کا سہرا بھی انہی کے سر سجنا چاہیے تھا مگر اہل مغرب کے لئے یہ گوارا نہ تھا کہ اس فتح کی نسبت اہل اسلام کی طرف ہو کہ انکے نزدیک اہل اسلام کی فتح درحقیقت مذہب اسلام کی فتح کے مترادف ہوتی جو انہیں ہرگز گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لئے جب انہوں نے ایسا کیا اور افغان مجاہدین کو آپس میں لڑوانے کی سازشیں بھی کیں تو مجاہدین کی طرف سے اس پر ردعمل کا اظہار کیا گیا جس نے اہل مغرب کے خلاف نفرت کے جذبات اور متعدد پر تشدد واقعات کو جنم دیا جن میں سے ایک ۱۹۹۳ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو بم دھماکے سے اڑانے کی کوشش کا واقعہ بھی شامل ہے۔ بوسنیا ہرزگوینا کے معاملہ میں جب اہل مغرب نے جانبداری اور ناانصافی کا مظاہرہ کیا تو مجاہدین اس کو بھی برداشت نہ کر سکے اور بوسنیائی مسلمانوں کی مدد کو جیسے ہو سکا، جا پہنچے۔ اُمت کے لئے مجاہدین کے اس احساس اور اہل مغرب کے خلاف چند واقعات (جو ان کی غیر منصفانہ پالیسیوں کا ہی ردعمل تھے)، کو مغربی ممالک نے کمال عیاری کے ساتھ بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی وغیرہ کا نام دے دیا اور اس طرح اسلام اور اہل اسلام کو بدنام کرنے اور ٹارگٹ بنانے کا ایک آسان ترین فارمولہ ان کے ہاتھ آ گیا جسے انہوں نے بعد ازاں پوری شدت و توانائی کے ساتھ دنیا بھر میں مسلمانوں کے استحصال اور مجاہدین اسلام کی بیخ کنی کے لئے استعمال کیا اور جس کا سلسلہ دن بدن بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

ایک روایت میں وتکون الملاحم کے الفاظ سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ صلح کے خاتمہ پر مسلمانوں اور اہل روم کے مابین کم از کم دو یا اس سے زیادہ جنگیں ہوں گی لہذا روایات میں رومیوں کی طرف سے اسی جھنڈے لیکر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا جو ذکر آیا ہے، اُس کا تعلق راقم کے خیال میں سب سے آخری جنگ سے ہے جسے دیگر روایات میں الملحمۃ العظمیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ غالب امکان ہے کہ یہ جنگ حضرت مہدی کے دور خلافت میں ہوگی جب امت مسلمہ کافی حد تک متحد ہو چکی ہوگی اور مسلمانوں کی متحدہ افواج کے مقابلہ میں رومی بھی ایک بڑا جنگی اتحاد تشکیل دیں گے اور مسلمانوں کے اتحاد میں دراڑیں ڈالنے کی بھی بھرپور کوشش کریں گے۔ رومیوں کا یہ کہنا کہ ہماری جنگ تو صرف اُن لوگوں سے ہے جنہوں نے ہماری سپاہیوں کو قیدی بنا لیا ہے، دراصل اس اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی ایک چال ہوگی۔ اُن کی یہ چال معلوم ہوتا ہے کہ کسی حد تک کامیاب رہے گی کیونکہ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کے مقابلہ میں اکٹھے ہونے والے مسلمانوں کے لشکر میں سے ایک تہائی جنگ سے فرار ہو جائیں گے، ایک تہائی شہادت کی موت سے ہمکنار ہوں گے جبکہ صرف ایک تہائی باقی بچنے والے فتح کا سہرا اپنے سر سجائیں گے۔

پس ثابت ہوا کہ عظیم ترین اور فیصلہ کن جنگ سے پہلے کم از کم دو یا اس سے زیادہ جنگیں ہوں گی تاہم روایات میں ان جنگوں کی تفاصیل بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق آنحضورﷺ نے قصداً خاموشی اختیار کی ہے جس میں بھی لازماً کچھ حکمتیں پوشیدہ ہوں گی۔ راقم کے خیال میں ان جنگوں کا نہ صرف آغاز ہو چکا ہے بلکہ ان میں سے اکثر جنگیں وقوع پذیر بھی ہو چکی ہیں۔

۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کو اس سلسلہء ملاحم کی پہلی جنگ یا آنجہانی صدام حسین کے الفاظ میں اُم المحارب کہا جاسکتا ہے جب اہل مغرب نے سازشوں کے جال بچھا کر پہلے عراق کا کویت پر قبضہ کروایا اور بعد ازاں یہ قبضہ ختم کروانے کی آڑ میں تاریخ کی شدید ترین بمباری کے ذریعے چند دنوں میں لاکھوں عراقی مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے علاوہ عرب ممالک کے وسائل کا بھرپور استحصال کیا۔ عراق پر مسلط کی جانے والی اس ہولناک و تباہ کن جنگ کے لئے الملحمۃ کا لفظ انتہائی موزوں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس جنگ کا افغانستان سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا جہاں صلح ٹوٹ جانے کا واقعہ پیش آیا تھا تاہم اس حقیقت کو اگر اُمت مسلمہ کی مجموعی صورتحال کے تناظر میں سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوشلزم کے خلاف سرد جنگ کی آڑ میں مسلمانوں نے اہل مغرب سے کافی مفادات حاصل کر لئے تھے جن میں سے کچھ کا تذکرہ قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح عراق نے ایرانی انقلاب کو محدود رکھنے کی خاطر ایران کے خلاف طویل جنگ لڑی جس میں اسے بھرپور امریکی سپورٹ حاصل رہی اور پاکستان کی طرح عراق نے بھی قابل ذکر فوجی قوت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ اہل مغرب کے مفادات بالخصوص انکے لے پالک اسرائیل کے لئے خطرہ کا باعث بن چکا تھا لہذا سب سے پہلے اسی ملک سے نبٹنے کے لئے اس کے گرد سازشوں کا جال بچھایا گیا۔ عراق کے خلاف کاروائی کی ایک اور وجہ اسکا تیل کی دولت سے مالا مال ہونا تھا جو اتحادیوں کے لئے ترجیح، ترغیب اور تحریص کا زیادہ بڑا سبب بنا تھا۔

جہاں تک افغانستان کا تعلق تھا تو انہوں نے مجاہدین کو آپس میں لڑوانے پر ہی اکتفا کیا تھا تاہم انہوں نے مجاہدین کو کمزور کرنے کی خاطر پاکستان کے راستہ آنے والے اسلحہ کی سپلائی کو بند کرنے کے علاوہ انکے لئے راولپنڈی میں قائم کئے گئے ہتھیاروں کے خفیہ مرکز (اوجڑی کیمپ) کو بھی ۱۹۸۸ء میں تباہ کروا ڈالنا ضروری سمجھا۔ مذید برآں انہوں نے کئی مجاہد رہنماؤں کو بھی شہید کروا ڈالا جن میں سرفہرست عظیم مجاہد رہنما عبداللہ عزام (جنہیں گاڈ فادر آف جہاد کہا جاتا ہے اور جو اسامہ بن لادن وغیرہ اکثر مجاہدین کے استاد) تھے۔ اُنہیں ۱۹۸۹ء میں انکے دو بیٹوں کے ساتھ پشاور میں شہید کیا گیا تھا۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ روایت میں صلح شکنی کے عمل کو اہل روم کی طرف منسوب کرنے کے علاوہ انکے اس طرز عمل کے متعلق غدر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو خفیہ طور پر عہد شکنی اور امانت میں خیانت کرنے کے لئے زیادہ تر مستعمل ہے۔ خود ہی اہل اسلام سے کئے گئے معاہدوں اور اپنے ہی وضع کردہ اصولوں و قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اہل مغرب نے اہل اسلام کو ہر ممکن حد تک نقصان پہنچانے کے لیے جو خفیہ حربے استعمال کئے اور اب تک کر رہے ہیں، اُن کے لئے غدر کا لفظ بالکل موزوں ہے۔ تاہم ۱۱ و مکروا و مکر اللہ ۱۱ کے قرآنی الفاظ کے مصداق ان تمام حربوں اور سازشوں کے باوجود اہل مغرب اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہی رہے ہیں اور وہ انشاء اللہ کبھی بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکیں گے جس کا ثبوت ان کی اب تک کی ناکامیاں ہیں۔ وہ اب تک اپنے عزائم میں کیونکر ناکام ہیں، اس کا اندازہ عراق اور افغانستان کے متعلق انکی ناکام پالیسیاں ہیں۔ افغانستان میں انکی مجاہدین کو آپس میں لڑوا کر وہاں اپنی من چاہی حکومت قائم کرنے کی سازشیں رنگ نہ لا سکیں اور بالآخر وہاں طالبان کی اسلامی حکومت کی صورت میں ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جس کا خواب مجاہدین اور دین کا درد رکھنے والے حضرات ایک طویل عرصہ سے دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف مشرق وسطیٰ میں صدام حسین انکے لئے

لوہے کا ایسا چنا ثابت ہوا جسے طویل عرصہ تک چبانے کے بعد بالآخر اُگلنا پڑا۔

اپنی ان تمام سازشوں میں ناکامی کے بعد انہوں نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کا ڈرامہ رچایا اور اپنی تمام تر قوت کے بل بوتے پر پہلے افغانستان کی اسلامی حکومت کا خاتمہ کیا اور پھر اپنے پرانے ہدف یعنی معدنی دولت سے مالا مال ملک یعنی عراق پر مختلف حیلوں بہانوں سے حملہ کرتے ہوئے اس پر قبضہ کر کے ہی دم لیا۔ لیکن اُن کا یہ تمام مکر وفریب اب پوری دنیا پر عیاں ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اور قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت عیسائی دنیا خود تقسیم ہو چکی ہے جس کی ایک بڑی وجہ پوری دنیا پر غالب رہنے کی امریکی خواہش ہے جسے یورپی ممالک پذیرائی بخشنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ آثار وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں اور اہل روم کے مابین آخری فیصلہ کن جنگ ارض فلسطین وشام کے علاقہ میں لڑی جائے گی تو اُس وقت عیسائی دنیا کی قیادت امریکہ کی بجائے پاپائے روم کے پاس ہوگی جو یورپی ممالک کو ایک وحدت میں پرونے اور مسلمانوں کی متحدہ افواج کے مقابلہ میں دنیا بھر کی عیسائی قوتوں کو صلیب کے جھنڈے تلے اکٹھا کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ہم جانتے ہی ہیں کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد وہ ایک نمائندہ قیادت وامامت سے محروم ہونے کی وجہ سے دن بدن پستی کی طرف ہی گرتے چلے جا رہے ہیں۔ انکی تعداد دنیا بھر میں قریباً ڈیڑھ ارب ہے، انکے پاس وافر قدرتی وسائل ہیں اور انہیں اللہ نے بہترین دماغی صلاحیتوں سے بھی نواز رکھا ہے۔ ان سب کے باوجود یہ اُمت دنیا بھر میں ذلت ومسکنت کا شکار ہے تو اسکی ایک ہی وجہ کہ یہ وحدت واتحاد سے محروم ہے۔ وحدت اُمت کی اصل علامت نظام خلافت ہے جو مسلمانوں کا حقیقی ورثہ ہے لیکن یہ اُمت اپنے اس ورثہ کو دقیانوسیت قرار دے کر اسکی طرف لوٹنے کیلئے اس لئے تیار نہیں کہ ان کا آئیڈیل بھی مغربی جمہوریت اور اسکے اصول بن چکے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُمت ان دنوں اُنہی حالات سے دوچار ہے جن سے قوم بنی اسرائیل حضرات طالوتؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ کی خلافت کے زمانہ سے پہلے کے حالات میں مبتلا تھی۔

نبی کریم ﷺ کی متعدد احادیث کی رُو سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ امت مسلمہ بھی بنی اسرائیل کے سے حالات سے دوچار ہوگی لہذا اس معاملہ میں ہمیں تاریخ بنی اسرائیل سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ بنی اسرائیل کے اس دور پر مختصر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ اس دور میں وہ متعدد قبائل میں منتشر تھے اور ایک مرکزی حکومت سے محروم تھے جس کی بناء پر وہ اپنے دشمنوں کے لئے تر نوالہ بنے ہوئے تھے۔ اُس دور کی صورتحال کا بہت اچھا نقشہ سورہ البقرۃ کی آیات ۲۴۶ تا ۲۴۷ میں اس طرح سے کھینچا گیا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا وَاَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ (۲۴۶) وَقَالَ لَهُمۡ نَبِیُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡهُ وَلَمۡ یُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰىهُ عَلَیۡکُمۡ وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَهٗ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ (۲۴۷)

۱۱ کیا آپ ﷺ نے موسیٰؑ کے بعد (انکی قوم) بنی اسرائیل کے سرداروں کے معاملہ پر غور نہیں کیا؟ جب انہوں نے اپنے نبی (حضرت سیموئیلؑ) سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے تا کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کر سکیں۔ انہوں نے فرمایا: کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر تم پر جنگ فرض کر دی جائے تو تم جنگ پر آمادہ نہ ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ (صورتحال یہ ہے کہ) ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور اپنے بیٹوں سے بھی (جدا کر دیا گیا ہے)؟ پس جب اُن پر جنگ فرض کر دی گئی تو وہ منہ پھیر گئے سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے، اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔ اور انکے نبیؑ نے ان سے کہا! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوتؑ کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے، (اس پر) انہوں نے کہا ! اُسے ہم پر بادشاہت کا حق کیونکر حاصل ہے جبکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے حقدار ہیں اور اسے تو وافر مال ودولت سے بھی نہیں نوازا گیا ہے۔ (نبیؑ نے) کہا! بے شک اللہ تعالیٰ نے اُسے تمہارے اوپر چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں (تمام لوگوں سے) بڑھایا ہوا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، اپنی حکومت وبادشاہت عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا علم والا ہے۔ ۱۱

ان آیات میں بنی اسرائیل کی جو حالت زار بیان کی گئی ہے، بعینہٖ یہی حالت آج اُمت مسلمہ کی ہو چکی ہے۔ آیات درج بالا کی رُو سے ہماری زبوں حالی کی بھی دو ہی بڑی وجوہات ہیں:

(۱) اُمت کے اندر مرکزیت یعنی ایک ایسے بااختیار اور نمائندہ ادارہ کی عدم موجودگی جو نہ صرف امت کے مفادات کی حفاظت کر سکے بلکہ مسلمانوں کے فریضہ شہادت علی الناس اور نبی کریم ﷺ کے مقصد بعثت یعنی غلبہء دین حق کو پورا کر سکے۔ اس نمائندہ ادارہ کی مثالی ترین صورت ادارہ خلافت ہی قرار دی جا سکتی ہے۔

(۲) بنی اسرائیل کی طرح اُمت مسلمہ کا بھی مال ودولت کی محبت (یعنی معاشی فتنہ) میں گرفتار ہونا۔ اس فتنہء وھن میں گرفتار ہونے کی خبر آنحضور ﷺ نے بھی ہمیں دے رکھی ہے۔

عدم خلافت اور معاشی فتنہ کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل سے دوچار یہ اُمت ان وجوہات کو دور کئے بغیر ان مسائل کو حل کر سکتی ہے اور نہ ہی موجودہ صلیبی یلغار کے آگے ایک مضبوط بند باندھ سکتی ہے۔ لیکن اُمت کی دینی و دنیاوی قیادتوں کو یہ حقیقت اچھی طرح از بر کر لینی چاہئے کہ انہیں بالآخر بنی اسرائیل کی طرح اُمت کے وسیع ترین مفاد کی خاطر ایک متفق علیہ رہنما کی قیادت میں متحد ہونا ہی پڑے گا لہذا میری تمام دینی و سیاسی رہنماؤں سے دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ جلد از جلد ایک ایسے قائد کی تلاش میں جُت جائیں جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے قابل قبول ہو اور اُمت کی صحیح سمت میں رہنمائی کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اللہ کی نصرت و رحمت بھی ہمارے شامل حال ہو جائے گی اور ہم موجودہ صلیبی یلغار کو نہ صرف روک دیں گے بلکہ دین اسلام کے عالمی غلبہ کی طرف پیش قدمی بھی شروع کر دیں گے۔ راقم کو یقین ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا اور مسلمانوں و اہل روم کے مابین جاری جنگوں کے سلسلہ کی آخری جنگ یعنی الملحمۃ العظمیٰ اہل اسلام کی پہلی اور آخری فتح ہی نہیں ہو گی بلکہ اس سے پہلے ہی مسلمان کچھ معرکوں میں اہل روم کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی یہ فتوحات انکے اتحاد یعنی مرکزیت یا با الفاظ دیگر قیام خلافت کے بعد ہی ممکن ہو سکیں گی اور ان فتوحات و وحدت اُمت مسلمہ کا ردعمل ہی ہو گا کہ عیسائی دنیا انکے مقابلہ میں ایک بار پھر پہلے سے بھی زیادہ جوش و ولولہ کے ساتھ متحد ہو کر یعنی اسی جھنڈوں کے ساتھ اسکے مقابلہ پر آ کھڑی ہو گی۔ اور یہ وہ وقت ہو گا جب اُمت مسلمہ اور عالم عیسائیت کی قیادت انکے بنیاد پرست طبقات کے پاس آ چکی ہو گی جس کی وجہ یہ ہو گی کہ ان دونوں اُمتوں کے نام نہاد سیکولر یا لبرل کہلائے جانے والے طبقات اپنی منافقانہ دوغلی پالیسیوں کی وجہ سے بالآخر شکست کھا جائیں گے اور میدان بنیاد پرست مذہبی طبقات کے لئے خالی ہو جائے گا۔ بنیاد پرست طبقات کا غلبہ دونوں امتوں کے اندر مذہبی جوش و خروش کو بڑھا کر اور انکے درمیان ٹکراؤ کی شدت میں اضافہ کر کے تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ الملحمۃ العظمیٰ کیلئے زمین ہموار کر دے گا جسے اہل کتاب کی روایات میں ہرمجدون (armageddon) کی جنگ قرار دیا گیا ہے اور جو خیر اور شر کی قوتوں کے مابین آخری اور فیصلہ کن جنگ ہو گی۔ اہل کتاب عیسائی دنیا خود کو خیر کی علمبردار قوت کے طور پر منوانے کی سب سے بڑی کوشش کرے گی لیکن اسے حقیقی اہل خیر (اہل اسلام) کے ہاتھوں ایسی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑے گا کہ آئندہ حکومت و غلبہ کی بُو باس انکے دماغوں سے ہمیشہ کے لئے نکل جائے گی۔

جب یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مستقبل کی اسلامی فتوحات قیام خلافت کے بعد ہی شروع ہو سکیں گی تو ہمیں اس متوقع خلافت کے نہ صرف قیام کی بھرپور جدوجہد کرنا ہو گی بلکہ قیام خلافت کے طریقہء کار پر بھی غور کرنا ہو گا۔ ہمارے ہاں ایک عام تصور یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے دوسرے دور خلافت راشدہ (جس کی خبر احادیث میں دی گئی ہے)، کا آغاز حضرت مہدی کی خلافت سے ہو گا۔ یہ تصور ہرگز درست نہیں بلکہ حضرت مہدی تو اس خلافت کے قیام کے بعد ہی منظر عام پر آئیں گے اور انکی حیثیت اپنے پیش رو خلیفہ کے جانشین کی ہو گی جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک خلیفہ کے انتقال کے بعد اُمت کی مسیحائی کے لئے خلیفہ مقرر کیا جائے گا۔ خلافت و ظہور حضرت مہدی کی حقیقت کیا ہے؟ ان سوالات کا جواب انشاءاللہ آئندہ صفحات میں دینے کی کوشش کی جائے گی۔

حضرت امام مہدی، خلیفہء اول دوم یا سوم؟

محمد نزیر یٰسین (naziryaseen@yahoo.com)

مثل مشہور ہے کہ ا ا جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ ا ا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ظلم خود بخود نہیں مٹ جایا کرتا بلکہ اسے مٹانے کے لئے ایک طاقتور اور با کردار شخصیت ناگزیر ہوا کرتی ہے۔ اور یہ شخصیت بھی محض اپنی ذات کے بل بوتے پر یہ عظیم کارنامہ سرانجام نہیں دیا کرتی جب تک کہ اسے ایک مضبوط، منظم اور اطاعت گزار جماعت میسر نہ آ جائے۔

مذکورہ بالا مشہور محاورہ سے جس قائد کی ضرورت و اہمیت از خود آشکارہ ہوتی ہے، اس کا ایک کامل مصداق حضرت امام مہدی کی شخصیت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی درج ذیل حدیث کے علاوہ متعدد دیگر روایات بھی اس حقیقت کا اظہار کرتی ہیں:

یملا الارض قسطا و عدلا کما ملئت ظلما و جورا۔

ا ا وہ (امام مہدی) زمین کو اُسی طرح عدل و انصاف سے بھر دیں گے جیسا کہ وہ انکی آمد سے قبل ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔ ا ا۔ (عن ابی سعید الخدریؓ، رواہ ابی داؤد)

لیکن حضرت امام مہدی کے متعلق وارد شدہ دیگر تمام روایات سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ وہ انبیاء و رُسل کی طرح دعوت دین کی کسی تحریک کا آغاز کریں گے اور نہ ہی اس دعوت و تحریک کو عام کرنے کے لئے ایک طویل و صبر آزما جدوجہد کریں گے بلکہ ان کا ظہور تو اچانک و دفعتاً ہو گا، ایک جماعت کثیر ان کی اطاعت پر آمادہ و مستعد ہو گی اور ان کی قیادت میں فتوحات پہ فتوحات حاصل کرنا شروع کر دے گی۔

جبکہ ایسا ہونا عملاً ممکن ہے اور نہ ہی تاریخی حقائق اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی آمد کی پیشگوئیاں تمام الہامی کتابوں میں موجود تھیں مگر اسکے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی آمد پر بھی ایسا کوئی معجزہ ظہور پزیر نہ ہوا تھا کہ لوگوں نے فی الفور آپ ﷺ کی اطاعت کرنا شروع کر دی ہو حتیٰ کہ وہ یہودی جو آپ ﷺ کی آمد سے قبل مشرکین عرب کو آپ ﷺ کے ظہور کے حوالہ سے خبردار کیا کرتے تھے، نے بھی آپ ﷺ کی آمد پر آپ کی نہ صرف اطاعت سے انکار کیا بلکہ آپ ﷺ کے بدترین دشمن بھی ثابت ہوئے۔

تو پھر ظہور حضرت مہدی کی حقیقت کیا ہے؟ کیا صدیوں سے قائم فرسودہ ظالمانہ نظام کو یکا یک جڑ سے اکھاڑ پھینکنا حضرت مہدی کے لئے ممکن ہو سکتا ہے؟

یہ بات تو ہم جانتے ہی ہیں کہ خلافت حضرت مہدی کا تعلق مستقبل کے اُس دور باسعادت سے ہے جسے روایات میں خلافت علی منہاج النبوۃ کے دور ثانی کا نام دیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت امام مہدی اس دور خلافت کے پہلے خلیفہ ہوں گے یا دوسرے اور یا پھر تیسرے؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں درج ذیل بنیادی نکات کو مدنظر رکھنا ہو گا:

(ا) ظہور مہدی کی روایات کے بغور مطالعہ سے اُن کے کردار کی حقیقت کو سمجھنا

(۲) سیرت النبی ﷺ اور اُمت کے پہلے دور خلافت راشدہ کا مطالعہ

(۳) بنی اسرائیل میں قائم ہونے والی خلافت راشدہ کا مطالعہ

اول الذکر کے متعلق پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت مہدی کے متعلق وارد شدہ اکثر و بیشتر روایات سے صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دعوت یا تحریک شروع نہیں کریں گے بلکہ ایک خلیفہ کے انتقال پر جب اُمت اختلاف کا شکار ہو جائے گی تو منصب خلافت کے لئے انہیں موزوں ترین شخصیت سمجھتے ہوئے ان کی بیعت کی جائے گی جیسا کہ درج ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے:

ا ا ایک خلیفہ کی موت کے وقت قوم اختلاف کا شکار ہو جائے گی۔ ایک آدمی بھاگ کر مدینہ سے مکہ چلا جائے گا۔ اس کے پاس مکہ کے کچھ لوگ آئیں گے، اسے زبردستی باہر نکال کر رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان اس کے ھاتھ پر بیعت کریں گے۔ ا ا (عن اُم سلمہؓ رواہ احمد وابوداوٗد)

قابل غور بات یہ ہے کہ درج بالا روایت اور دیگر متعدد روایات میں جس خلیفہ کی وفات کا ذکر ہے، آیا وہ ایک خلیفہ راشد ہوگا یا پھر دور ملوکیت کا ایک نام نہاد خلیفہ؟

نبی کریم ﷺ سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ غلامی والی ملوکیت کے ایک نام نہاد حکمران کو خلیفہ قرار دیں بالخصوص جب کہ وہ خلافت راشدہ کے دور ثانی سے بالکل متصل ہی ہو۔

دور ملوکیت اور دور خلافت دو الگ الگ انتہائیں ہیں جیسا کہ اُس روایت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے جس میں آپ ﷺ نے اُمت کے پانچ ادوار یعنی نبوت، خلافت علی منہاج النبوۃ۔ ظالم ملوکیت، غلامی والی ملوکیت اور خلافت علی منہاج النبوۃ، بیان کئے ہیں۔ (عن نعمان بن بشیرؓ، رواہ احمد)

یقیناً آپ ﷺ اس معاملہ کو خلط ملط نہیں کر سکتے تھے لہذا آپ ﷺ نے جس خلیفہ کی وفات کا ذکر کیا ہے، وہ راقم کے خیال میں ایک خلیفہء راشد ہی ہوگا یعنی ان کے ظہور سے قبل خلافت قائم ہو چکی ہوگی۔

ثانی الذکر کے متعلق پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ آنحضور ﷺ ایک طویل جان گسل جدوجہد کے بعد ہی اقامت دین وغلبہء دین حق کے مشن میں کامیاب ہوئے تھے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ کا دور نبوت بھی حقیقت کے اعتبار سے دور خلافت ہی تھا کیونکہ آپ ﷺ خلیفۃ اللہ فی الارض تھے تاہم یہ اور بات ہے کہ آپ کی خلافت بالفعل اُسی وقت قائم ہو سکی تھی جب آپ ﷺ کو تمکن فی لارض عطا ہوا تھا۔ حضرات خلفائے راشدین نے تو اُس نظام خلافت کو قائم و دائم رکھنے اور اسے پوری دنیا پر غالب کرنے کی کوششیں کی تھی۔

دور خلافت راشدہ ثانی سے قبل چونکہ دین اللہ مغلوب ہو چکا ہوگا لہذا اسے دوبارہ قائم و غالب کرنے کے لئے بھی آنحضور ﷺ کی طرح ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ناگزیر ہوگی۔

تیئیس (۲۳) برس کے عرصہ میں دین اللہ کو قائم و غالب کر دینا یقیناً نبی کریم ﷺ کا ایک عظیم معجزہ تھا تاہم اب دوبارہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔ اگرچہ اس کام کی تکمیل تو لازماً کسی ایک مخصوص شخصیت کے ذریعے ہی ہوگی تاہم اسکے لئے زمیں ہموار کرنے میں اسلاف کی تجدیدی واحیائی مساعی کا بڑا اہم بنیادی کردار بھی شامل ہوگا۔

تاہم کامیابی اُسی وقت نصیب ہوگی جب اذن الٰہی بھی ہوگا اور واقعتاً اُسی نہج پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جدوجہد کی جائے گی جو امت کے پہلے حصہ کے لئے آنحضور ﷺ نے اختیار کیا تھا جیسا کہ مرض الوفات میں حضرت عمرؓ کی بطور خلیفہ نامزدگی کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا تھا:

اے لوگو! دنیا سے ڈرو اور اس پر بھروسہ مت کرو، یہ (دنیا) دھوکے باز ہے، تم آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور اسے پسند کرو کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی محبت دوسری سے نفرت کا باعث ہوتی ہے، یہ معاملہ (یعنی خلافت کا مسئلہ) جو اس وقت ہمارے لئے انتہائی اہم ہے، اس کا آخر بھی اسی چیز سے اصلاح پزیر ہوگا جس سے اس کے اول نے اصلاح پائی اور اسکی برداشت اور اس ذمہ داری کو وہی شخص نباہ سکتا ہے جو تم میں طاقت ومقدرت کے لحاظ سے بہتر ہو، جو ضبط نفس کے لحاظ سے پختہ تر ہو اور کسی بھی سختی کے وقت تاثر نہ لینے میں مضبوط ہو یعنی اعصابی لحاظ سے طاقتور ہو اور نرمی کے زمانہ میں وہ خوش مزاج ہو، مردم شناس ہو، اپنے اردگرد خوشامدی ٹولے سے زیادہ عقلمندوں کو ترجیح دیتا ہو۔ جسکے اوقات تعمیری ہوں اور جو اندیشہ ہائے فردا سے غم حال کی تعمیر میں منہمک ہو، جو کسی سے حصول علم میں حیا محسوس نہ کرتا ہو، جو اچانک حادثات میں ڈانوان ڈول نہ ہوتا ہو، جو معاشی استحکام کا ذہن رکھتا ہو، جو اپنے غصہ کی سرکشی وظلم میں قومی دولت کی خیانت وتقصیر کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔ اس کے ذہن میں سفر آخرت کی تیاری کے سامان کا خیال رہتا ہو اور یہ سامان آخرت اللہ کا ڈر اور اسکی اطاعت ہے اور ان تمام صفات کا حامل عمر بن الخطابؓ ہے۔ (بحوالہ حیات الصحابہ از مولانا محمد یوسف کاندھلوی، بعنوان من تکمل الخلافۃ)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خطبہ کے درج ذیل دو نکات خصوصاً قابل غور ہیں:

(ا) اس اُمت کے آخری حصہ کی اصلاح اُسی طریقہء کار کے مطابق ہوگی جو اس کے پہلے حصہ کے لئے نبی کریم ﷺ نے اختیار کیا تھا اور اُمت کے آخری حصہ کا اصلاح شدہ معاشرہ یقیناً وہی ہوگا جس میں دوبارہ نظام خلافت قائم ہوگا یعنی حضرت مہدی، حضرت عیسیٰؑ اور انکے علاوہ دیگر خلفاء کا زمانہ جن کا نام لیکر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) جس شخصیت کے ہاتھوں یہ کارنامہ سرانجام پائے گا، وہ یقیناً اُنہی صفات کی حامل ہوگی جن کا ذکر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے اس خطبہ میں کیا ہے۔ ان صفات کی حامل بہترین شخصیت اُس وقت حضرت عمرؓ کی تھی لہذا آپؓ نے انہی کو بطور خلیفہ نامزد کیا تھا لہذا حضرت عمرؓ کی طرح مضبوط اور دین ودنیا کی ایک جامع شخصیت کے ہاتھوں ہی قیام خلافت کا عمل ممکن ہو سکے گا۔

جہاں تک اُمت کے پہلے دور خلافت راشدہ کا تعلق ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۃ الرسول بننے کا اعزاز حاصل کرنے والی شخصیت یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے، اسلام کی خاطر سب سے زیادہ قربانیاں دینے والے اور ہمہ وقت آپ ﷺ کی ہم نشینی کرنے والے شخص تھے۔ آپؓ کا بطور خلیفہ انتخاب ہنگامی حالات میں منعقد ہونے والی اہل اسلام کی ایک محدود نمائندہ جماعت نے کیا تھا۔ اگرچہ آپؓ کا تعلق قریش کے سب سے چھوٹے قبیلہ سے تھا تاہم اپنی خدمات وصلاحیتوں کے سبب دوسرے تمام قبائل کے لئے قابل قبول قرار پائے۔ آپؓ کا بیشتر دور استحکام خلافت کے لئے اقدامات کی نذر ہوا اور اس طرح آپؓ نے ہی بقیہ خلفائے راشدین کے لیے وہ بنیاد فراہم کی تھی جس پر انہوں نے نظام اسلام کی ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس عظیم کارنامہ کو ہم نبی کریم ﷺ کے عملی مشن کا تکملہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔

اسکے برعکس اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے حضرت مہدی کا کردار (روایات کی رو سے) مذکورہ بالا دونوں کرداروں یعنی نبی کریم ﷺ کے کردار (دعوت کا آغاز کرنے والی شخصیت) اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کردار (یعنی آغاز میں ہی داعیء اسلام کا ہمراہی بننے والی شخصیت) کے کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔

بلکہ اُن کا کردار تو ایک ایسی شخصیت کے طور پر دکھائی دیتا ہے جو کسی خاص معرکہ کے دوران ایک نمایاں کارنامہ سرانجام دینے کی وجہ سے یکا یک لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن کر ان کی امیدوں کا مرکز ومحور بن جایا کرتی ہے جیسا کہ ثالث الذکر کے حوالہ سے ابھی بیان کیا جا رہا ہے۔

ثالث الذکر یعنی بنی اسرائیل میں قائم ہونے والی خلافت راشدہ (جس کا ذکر قرآن حکیم کی سورہ البقرۃ کی آیات ۲۴۶ تا ۲۵۲ میں کیا گیا ہے) کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں نبی کریم ﷺ کے درج ذیل دو

فرامین کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا:

(۱) میری اُمت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہوکر رہیں گے جن سے بنی اسرائیل کو سابقہ پیش آیا۔ (عن عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ، رواہ ترمذی)

(۲) اس قرآن میں تم سے پہلوں کی خبریں بھی موجود ہیں اور تم سے بعد والوں کی بھی۔ (عن حضرت علیؓ ، رواہ ترمذی)

قرآن حکیم اور بائبل کی روشنی میں بنی اسرائیل میں قائم ہونے والی خلافت راشدہ (حضرت طالوتؑ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کی خلافت) کے مطالعہ سے درج ذیل اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اس خلافت کا قیام اُس وقت ممکن ہوسکا جب بنی اسرائیل اپنے دشمن کے ہاتھوں مسلسل ہزیمت کا شکار ہو رہے تھے۔

(۲) سرداران بنی اسرائیل اُس وقت ہی حضرت طالوتؑ کی خلافت پر متفق ہو سکے جب اُن پر ایک مرکزی حکومت کے قیام کی اہمیت پوری طرح واضح ہوگئی۔

(۳) سرداران بنی اسرائیل نے اُس وقت کے نبی حضرت سیموئیلؑ سے درخواست کی کہ وہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیں۔

(۴) حضرت سیموئیلؑ نے جب باذن اللہ حضرت طالوتؑ کو خلیفہ مقرر کرنے کا اعلان کیا تو سرداران بنی اسرائیل نے طالوتؑ کی معاشی حالت کو کمزور سمجھتے ہوئے اور خود کو اُن سے فائق خیال کرتے ہوئے اپنا استحقاق جتلایا۔ گویا سرداران بنی اسرائیل کے نزدیک کسی شخص کی فضیلت کا معیار اُس کا معاشی طور پر خوشحال ہونا تھا جیسا کہ یہی معیار فضیلت آج ہمارے ہاں بھی برقرار ہے۔

(۵) بنی اسرائیل کے سرداروں کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے حضرت سیموئیلؑ نے استحقاق خلافت کے جو معیارات بیان فرمائے، وہ تھے علم اور جسمانی صحت وتندرستی میں دوسروں پر فوقیت۔ یہاں علم سے مراد محض علم دین نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خود حضرت سیموئیلؑ نبی ہونے کے ناطے حضرت طالوتؑ پر فوقیت رکھتے تھے لہذا یہاں دین اور دنیا دونوں کا علم مراد ہے۔ گویا حضرت طالوتؑ دین اور دنیا دونوں کا علم رکھنے والی ایک جامع شخصیت کے مالک تھے۔ اسی طرح یہاں جسمانی طور پر مضبوط ہونے سے مراد ایک مضبوط ڈیل ڈول والی کڑیل شخصیت کا مالک ہونا مراد نہیں بلکہ ایک مضبوط اعصاب کی مالک شخصیت ہونا مراد ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک نحیف ونزار جسم کے مالک ہونے کے باوجود ہمارے پہلے خلیفہء راشد قرار پائے اور جیسا کہ قبل ازیں بیان کئے گئے اُن کے خطبہ سے بھی یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

(۶) حضرت طالوتؑ کا تعلق بنیامین کے قبیلہ سے تھا جو بنی اسرائیل کا سب سے چھوٹا قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل اور اُمت مسلمہ کے پہلے خلفائے راشدین کے مابین یہ ایک معنی خیز مماثلت ہے کہ دونوں کا تعلق اپنی قوم کے سب سے چھوٹے قبیلوں سے تھا۔ تاریخ میں ایسی اور بھی مثالیں ملتی ہیں کہ مختلف قبائل اور گروہوں میں بٹی ہوئی قومیں ایک سب سے چھوٹے قبیلہ یا گروہ کے کسی باصلاحیت شخص کی بدولت بنیان مرصوص بن کر سامنے آئیں اور اقوام عالم میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرنے کا سبب بنیں۔ سب سے چھوٹے گروہ کے شخص کو مرکز ملت بنا لینے کی ایک معقول وجہ یہ بھی سامنے آتی ہے کہ اُس کے مفادات کا دائرہ دوسروں سے کمتر ہونے کی بناء اس کی طرف سے غیر ضروری استحصال کے امکانات بھی سب سے کم ہوا کرتے ہیں۔

(۷) بنی اسرائیل اور اُمت مسلمہ کی خلافت ہائے راشدہ کے مابین ایک اہم ترین فرق یہ نظر آتا ہے کہ اُمت مسلمہ میں نظام خلافت اُمت کے موسس، اولین داعی وشارع حضرت محمد ﷺ کے ذریعے ہی قائم ہوگیا تھا جبکہ بنی اسرائیل میں صورتحال اس سے کافی مختلف نظر آتی ہے۔ ہم جانتے ہی ہیں کہ بنی اسرائیل کے شارع حضرت موسیٰؑ بھی حضور اکرم ﷺ کی طرح خلیفۃ اللہ فی الارض تھے۔ چونکہ وہ رسالت کے منصب پر فائز تھے لہذا اپنے بھائی حضرت ہارونؑ اور گنتی کے چند دیگر مخلص اصحاب رکھنے کے باوجود بھی وہ اپنی قوم پر غالب ہی رہے لیکن نبی کریم ﷺ کی طرح انہیں ایک ایسی اطاعت گزار جماعت صحابہؓ میسر نہ آسکی جو نظام خلافت کو قائم کرنے میں انکی مدد ومعاون ثابت ہوتی لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے اندر وہ نظام مملکت یا بالفاظ دیگر نظام خلافت قائم نہ ہوسکا تھا جو کہ بعد ازاں آنحضور ﷺ اپنے جانثار صحابہؓ کے ذریعے قائم کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ آنحضور ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں تو سیاسی وروحانی دونوں خلافتیں یکجا ہوگئیں تھیں جبکہ بنی اسرائیل اس سعادت سے محروم رہے۔ رسول ہونے کے ناطے حضرت موسیٰؑ کی ذات میں تو یہ دونوں خلافتیں یکجا تھیں تاہم اُن کے بعد یہ منقسم ہوگئیں۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد اور حضرت طالوتؑ کی خلافت سے پہلے کے درمیانی دور کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں دور قضاء کا نام دیا گیا ہے جس میں انبیاء بنی اسرائیل اپنی قوم کو دینی تعلیمات دینے کے علاوہ کچھ شرعی فیصلے بھی نبٹاتے رہتے تھے تاہم مجموعی طور پر سیاسی قیادت مختلف قبائل کے سرداروں کے پاس ہی رہی۔ یہ قبائل آپس میں دست وگریبان ہونے کے علاوہ اپنے دشمنوں کا تختہء مشق بھی بنتے رہے جس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنی ایک مرکزی حکومت قائم نہ کی تھی جو ان کے اپنے مسائل کو حل کرنے کے علاوہ انہیں دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا کام بھی دیتی۔ دین اور دنیا کی یہ تفریق اُنکے درمیان ایک طویل عرصہ تک چلتی رہی جس کی وجہ سے حالات بنی اسرائیل کے لئے دن بدن ناموافق ہوتے رہے اور دشمن ان پر دن بدن غالب آتے چلے گئے۔ یہ قبائل اپنے ان دشمنوں کے خلاف اپنے اپنے وسائل اور طریقہء کار کے مطابق تو برسرپیکار رہے تاہم ایک مرکزی حکومت کے قیام سے بھی گریز جاری رکھتے رہے جس کی وجہ اپنی اپنی بڑھائی کا زعم اور ایک دوسرے پر عدم اعتماد ہی قرار دی جاسکتی ہے۔ جب حالات حد سے زیادہ گھمبیر ہوگئے تو انہوں نے نبیء زمانہ حضرت سیموئیلؑ سے عرض کی کہ انکے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیا جائے تاکہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف جہاد کرسکیں۔ یہاں ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بنی اسرائیل شعوری یا لاشعوری طور پر خلیفہ کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کررہے تھے حالانکہ دین اللہ کا منشاء ومقصود قیام خلافت ہے نہ کہ بادشاہت۔ مزید برآں وہ جہاد فی سبیل اللہ بھی صرف اپنے اوپر حملہ آور دشمنوں کے خلاف لڑنا ہی سمجھ یا قرار رہے تھے حالانکہ اصل جہاد تو دین اللہ کے قیام وغلبہ کے لئے ہوتا ہے نہ کہ محض اپنی مدافعت وآزادی کے لئے۔ بعینہ یہی صورتحال آج اس اُمت محمدیہ کو بھی درپیش ہے۔ اس اُمت کی اکثریت بھی خلافت کی بجائے مروجہ جمہوریت کو پسند کرتی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ جو خالصتاً کلمۃ اللہ کے غلبہ کے لیے ہوتا ہے، کے بارے میں بھی غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ محض اپنی مدافعت وآزادی کے لئے ہی جنگ کو جائز سمجھنا اس اُمت کا بھی مسئلہ بن چکا ہے اور بہت سی مخلص دینی جماعتیں بھی اسی غلط فہمی کا شکار نظر آتی ہیں۔

المختصر جب کافی لیت ولعل اور قیل وقال کے بعد بنی اسرائیل کے تمام قبائل نے متفقہ طور پر حضرت طالوتؑ کو بطور خلیفہ قبول کرلیا تو انہوں نے اپنے دشمنوں کے خلاف ایک منظم ومربوط جہاد کا آغاز کردیا۔ اسی مرحلہء جہاد کے دوران ایک اہم معرکہ میں حضرت داؤد کی شخصیت اچانک اُبھر کر سامنے آئی جنہوں نے دشمن کے سب سے بڑے اور ناقابل شکست سمجھے جانے والے کمانڈر جالوت کو ایک انوکھی تدبیر کے ذریعے قتل کرکے تمام بنی اسرائیل کے دل جیت لئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعد ازاں انہیں حضرت طالوتؑ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے علاوہ اُن کی جانشینی کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

راقم کے خیال میں یہی معاملہ مستقبل میں ظاہر ہونے والے حضرت امام مہدی کا ہے۔ اُن کے ظہور سے پہلے خلافت قائم ہوچکی ہوگی اور اس دور خلافت کے دوران حضرت مہدی محمد یا احمد بن عبداللہ کے حقیقی

نام کے تحت اپنے کسی خاص کارنامہ کی بناء پر مشہور و معروف ہو جائیں گے۔ روایات میں بیان کی گئی علامات کی وجہ سے اپنے اور پرائے سب جان جائیں گے کہ مستقبل کا امام مہدی یہی شخص ہے۔ اب دشمن انکی جان کے درپے ہو جائیں گے جس کی وجہ سے وہ عارضی طور پر روپوش ہو جائیں گے جیسا کہ بعض روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بار ظہور کے بعد منظر عام سے غائب ہو جائیں گے۔ خلیفہء وقت کے انتقال کے بعد انکا دوبارہ ظہور بیت اللہ میں اُس وقت ہوگا جب اہل نظر کی ایک جماعت اُنہیں پالے گی اور منصب خلافت کو سنبھالنے پر بھی آمادہ کر لے گی۔

حضرت امام مہدی کی اس عارضی نوعیت کی غیبت کی کچھ روایات کی وجہ سے ہی غالباً اثنا عشری فرقہ نے امام غائب کا عقیدہ تراش رکھا ہے۔ بالکل اسی طرح کا معاملہ تحریک مجاہدین کے امیر حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ ہوا۔ بالاکوٹ کے آخری معرکہ میں چونکہ انکی میت کی مکمل شناخت نہ ہو سکنے کی وجہ سے معاملہ قدرے مشتبہ ہو گیا تھا لہذا انکے بعض متبعین و مریدین نے انہیں امام مہدی خیال کرتے ہوئے انکی عارضی غیبت اور دوبارہ ظہور کا فسانہ گھڑ لیا تھا۔

ظہور مہدی کا معاملہ اگر ایسا ہی ہو جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تو انکی ظہور سے قبل ایک یا دو خلفاء کی خلافت کا انعقاد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ راقم کے ذاتی خیال کے مطابق حضرت مہدی کے پیش رو خلفاء دو ہی ہوں گے۔ پہلا خلیفہ وہ ہوگا جس کی جدوجہد کے نتیجہ میں نظام خلافت قائم ہوگا جبکہ دوسرا اسکا ایسا جانشین ہوگا جو قیام و انعقاد خلافت میں اہم ترین کردار ادا کرے گا۔ اس دوسرے خلیفہ کے بعد اُمت کے اندر پھر اختلاف پیدا ہو جائے گا جس کا خاتمہ حضرت مہدی کے ظہور کی صورت میں ہی ممکن ہو سکے گا۔ جس طرح اُمت کے پہلے دور خلافت میں نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی سمیت پانچ خلفاء تھے، اُسی طرح اُمت کے دوسرے دور خلافت میں بھی پانچ ہی خلفاء ہوں گے جن میں سے تین کے نام روایات میں بیان کر دیئے گئے ہیں یعنی بالترتیب حضرت امام مہدی، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مقعد جبکہ ان سے قبل کے دو خلفاء کے معاملہ کو صیغہء راز میں رکھا گیا ہے جس کی وجوہات آخر میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

بہت سے قارئین کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھ چکا ہوگا کہ خلافت راشدہ ءثانی کا قیام و انعقاد کیونکر ممکن ہو سکے گا جبکہ حال یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کئی براعظموں پر پھیل چکی ہے، لاتعداد فرقوں و گروہوں میں بٹ چکی ہے اور مختلف ریاستوں میں اسے تقسیم کر دیا گیا ہے؟ ان سوالات کے جوابات کے لئے درج ذیل نکات کو مدنظر رکھنا ہوگا:

(۱) احیائے اسلام یا بالفاظ دیگر قیام خلافت اُسی نہج پر جدوجہد سے ممکن ہو سکے گا جو خلیفۃ اللہ فی الارض یعنی رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا تھا یعنی ایک ایسی الجماعۃ کی تیاری و قیام جو رائج الوقت باطل نظام کے ساتھ ٹکر لینے اور اسے شکست فاش سے دوچار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ پس جو جماعت حقیقی معنوں میں منہج انقلاب نبوی ﷺ کو اختیار کرے گی، کامیابی بھی اُسی کا مقدر ٹھہرے گی۔

(۲) قیام خلافت کی عملاً ابتداء کسی ایک مخصوص خطہء زمیں سے ہی ممکن ہو سکتی ہے جیسا کہ ہم جانتے ہی ہیں کہ آنحضور ﷺ نے پہلے جزیرۃ العرب کی سرزمیں پر ہی نظام خلافت قائم کیا تھا جہاں سے یہ نظام باقی دنیا تک پھیل گیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت بھی مترشح ہوتی ہے کہ قیام خلافت کی جدوجہد کرنے والے شخص کا اولین ہدف اسکی اپنی قوم ہونی چاہئے۔

(۳) قیام خلافت عملاً اُسی وقت ممکن ہو سکے گا جب نظام خلافت کے کسی داعی کو کچھ مضبوط گروہوں کی عملی تائید و نصرت حاصل ہو جائے گی جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مدینہ میں ایک اسلامی ریاست کا قیام اُسی وقت ممکن ہو سکا تھا جب اوس اور خزرج کے دو اہم قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ یہ گروہ داعی کے اپنے ہم قوم بھی ہو سکتے ہیں اور دیگر اقوام میں سے بھی۔

(۴) چونکہ اُمت محمد ﷺ بنی اسرائیل کی طرح منتشر و منقسم ہو چکی ہے لہذا قیام خلافت کے آخری مرحلے یعنی انعقاد خلافت کے لئے ہمیں تاریخ بنی اسرائیل سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ بعض حضرات کا یہ کہنا کہ مسلمان اس حد تک تقسیم ہو چکے ہیں کہ اب ان کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا ہو ہی نہیں سکتا، ہرگز درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر بنی اسرائیل اپنی پراگندگی و انتشار کے باوجود حضرت طالوتؑ کی قیادت پر متفق ہو سکتے ہیں تو خیر اُمت کہلانی والی یہ اُمت محمد ﷺ کیسے بانجھ قرار دی جا سکتی ہے؟

(۵) اتحاد اُمت کے لئے ایک ایسی شخصیت ناگزیر ہوگی جسے مسلم معاشرہ کے تمام طبقات و فقہی مسالک کا اعتماد حاصل ہو۔ ایک ایسی شخصیت جسے دینی تعلیم سے بہرہ ور طبقات (یعنی طبقہء علماء) اور جدید عصری علوم کے ماہر طبقات اپنا رہنما تسلیم کر سکتے ہوں۔ جو صداقت و امانت کی صفات سے متصف ہو اور اپنی منتشر و پراگندہ قوم کو دوبارہ ایک لڑی میں پرو کر انہیں اپنے دشمنوں کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہو۔ اس معاملہ میں ہمارے لئے نبی کریم ﷺ کی قبل از نبوت زندگی کا وہ واقعہ ایک رہنما مثال بن سکتا ہے جب آپ ﷺ نے کمال فراست سے کام لیتے ہوئے تمام قبائل عرب کو متحد رکھنے کی غرض سے حجر اسود کو ایک چادر پر رکھ کر تمام قبائل کے سرداروں کو اسکے اٹھانے والوں میں سے بنا کر اس کار خیر میں شریک کر لیا تھا۔ خلافت کا استحقاق رکھنے کے باوجود اس کے عملاً قیام میں تمام طبقات و مکاتب فکر کو اس کار خیر میں حصہ دار بنا لینے کی صلاحیت رکھنے والا شخص ہی راقم کے خیال میں اس اُمت کو ایک وحدت میں پرو سکتا ہے۔ برصغیر میں متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں کہ یہاں کی تمام دینی قوتوں نے کسی خاص مسئلہ پر یکساں موقف اختیار کرتے ہوئے مشترکہ لائحہ عمل و تحریک برپا کی ہو جس کی نمایاں ترین مثالوں میں خلافت عثمانیہ کے حق میں چلائی جانے والی تحریک خلافت، قیام پاکستان کے بعد ایک اسلامی دستور کی خاطر بائیس مشترکہ نکات پر متفق ہونا، فتنہ قادیانیت کے خلاف مشترکہ کوششیں کرنا، ۱۹۷۹ء میں تحریک نفاذ نظام مصطفیٰ چلانا، دفاع پاکستان و افغانستان کونسل کے نام سے ایک مشترکہ محاذ تیار کرنا اور بعد ازاں اسی کونسل کا متحدہ مجلس عمل کی شکل اختیار کرنا وغیرہ۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کی دینی قوتیں متحد و متفق ہونے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہیں اور اس بات کی قوی امید کی جا سکتی ہے کہ جب قیام خلافت کا وقت آن پہنچے گا تو بھی یہاں کی دینی قوتیں باہم متحد ہو کر نظام خلافت کے قیام میں اپنا کردار ادا کریں گی۔

(۷) نظام خلافت کا بالفعل قیام اُمت کے کسی معروف ترین، جید، ثقہ اور صاحب عزیمت عالم دین کے ذریعے ہی ممکن ہو سکے گا جب وہ دیگر تمام دینی قوتوں کو ایک معین شخص کی بیعت کر کے اسے خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لینے کا مشورہ دے گا۔ راقم کے اس خیال کی تصدیق حضرت طالوتؑ و حضرت سیموئیلؑ کے قصہ سے تو ہوتی ہی ہے، تاریخ برصغیر کے دو اہم واقعات بھی اسکی تائید کرتے ہیں:

ان دونوں میں سے پہلا واقعہ حضرت شاہ اسماعیلؒ (جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے تھے) کا ہے جنہوں نے ایک بڑے عالم دین ہونے کے باوصف مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ کی نہ صرف بیعت کی بلکہ اُن کی تحریک میں بھرپور عملی حصہ لیتے ہوئے جام شہادت بھی نوش کیا۔ شاہ صاحبؒ کے اس فعل کو آدم و ابلیس کے مابین جاری معرکہء خلافت میں حضرت انسان کی ایک اہم فتح قرار دیا جا سکتا ہے اور صرف اس حقیقت کو سمجھ لینے سے ہی حضرت شاہ صاحبؒ کے کردار کو مسخ کرنے کی مذموم شیطانی کوششوں کا سراغ مل جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ ریشمی رومال تحریک کے روح رواں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا جنہوں نے اسارت مالٹا سے رہائی کے بعد جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں کو ایک غیر عالم دین سیاسی شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی بیعت کر لینے کی وصیت کی تھی۔ اُن کی وصیت پر اگرچہ بوجوہ عمل درآمد ممکن نہیں ہو سکا تھا تاہم یہ بات عیاں ہے کہ انہوں نے حضرت سیموئیلؑ اور حضرت شاہ اسماعیلؒ کے نقوش قدم کی پیروی کی تھی۔

برصغیر کے ان دونوں نامور علمائے کرام کے اس طرز عمل سے نبی کریم ﷺ کی اس مشہور حدیث کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے کہ ۱۱ میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہوں گے ۱۱۔
پس معلوم ہوا کہ علوم نبویہ کے وارث کسی معروف، بااثر، باہمت اور ثقہ عالم دین کی تجویز اور عملی شرکت سے ہی نظام خلافت کا عملی قیام ممکن ہو سکے گا۔
جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کی بیعت امامت منعقد نہ ہو سکنے کا تعلق ہے تو اسکی توجیح تین باتوں سے ہی ہو سکتی ہے: اول یہ کہ وہ اس بار امامت کے اہل و مستحق نہیں تھے لہذا جن حضرات نے اس بناء پر اس بیعت کی مخالفت کی تھی، اُن کا موقف مستقبل میں درست بھی ثابت ہو گیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام حکومت الہیہ کے قیام کے لئے اپنی جدوجہد سے دست بردار ہو کر انڈین نیشنل کانگرس کے ہی ہو کر رہ گئے۔ دوم یہ کہ بعض علماء نے تکبر و حسد کی بناء پر بھی شیخ الہند کی اس تجویز کو رد کیا ہو گا جس کی بناء پر یہ بیعت منعقد نہ ہو سکی اور سوم یہ کہ ابھی وہ وقت ہی نہ آیا تھا جو قادر مطلق کی طرف سے قیام خلافت کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے اور راقم کے خیال میں یہی اس کی بہترین توجیح ہے۔
(۸) حضرت سیموئیلؑ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور شیخ الہندؒ کے واقعات سے یہ حقیقت بھی مترشح ہوتی ہے کہ جس شخص کو بیعت خلافت کے لئے نامزد کیا جائے گا، وہ ایک سکہ بند عالم دین نہیں بلکہ ایک گہرا فہم دین و حقیقی درد دین رکھنے والا سیاسی یا مجاہد رہنما ہو گا کیونکہ دین و دنیا کی ایک جامع شخصیت ہی منصب خلافت کے لئے موزوں ترین ہو سکتی ہے۔
(۹) غالب امکان یہ ہے کہ حضرت طالوتؑ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح خلافت کے لئے نامزد ہونے والے شخص کی ذاتی نمائندگی تو دوسروں سے کم ہو گی لیکن اپنے بے داغ کردار، متوازن شخصیت اور دیگر اوصاف کی بناء پر اسکا حلقہ اثر کافی وسیع ہو جائے گا جس کی بناء پر وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے قابل قبول بن جائے گا۔
(۱۰) جو شخص قیام خلافت کی جدوجہد کرے گا، اُسے لازماً مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑے گا کیونکہ قیام خلافت کی جدوجہد درحقیقت رائج الوقت نظام کے خلاف ایک اعلان بغاوت ہو گی جس کا ردعمل بھی لازماً سامنے آئے گا۔ سید احمد شہیدؒ کی جدوجہد پر ہی نظر دوڑا لیجئے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اُن کی ناکامی میں غیروں سے زیادہ اپنوں نے کردار ادا کیا تھا۔ نظام خلافت کے داعی کو چونکہ اپنی ہی قوم کے اندر اسکی جدوجہد کرنا ہو گی لہذا کامیابی اسکا مقدر تب ہی بن سکے گی جب وہ اپنی توجہ صرف اور صرف نظام اسلام کے قیام پر مرکوز رکھے گا اور اپنے خلاف ہونے والی تمام تر مخاصمانہ کاروائیوں (خواہ وہ زبانی شکل میں ہوں یا تحریری اور یا پھر عملی) کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے گا اور ترکی بہ ترکی اور یا پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی پالیسی سے احتراز کرے گا۔ اسکے برعکس وہ اپنا دفاع ایک ایسے احسن طریقہ سے کرے گا کہ اسکی مخالفت میں پیش پیش رہنے والے اشخاص یا گروہ بھی بالآخر اس کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر اسکے مشن میں اسکے حامی و مددگار بن جائیں گے۔ قرآن حکیم کی درج ذیل اہم آیات (جو مقام عزیمت و ولایت کا احاطہ کئے ہوئی ہیں) اسی حقیقت کو بیان کرتی ہیں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا/ تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا/ وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ/ (۳۰) نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ/ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ/ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ/ (۳۱) نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ/ (۳۲) وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا/ وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ/ (۳۳) وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ/ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ/ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ/ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ/ (۳۴) وَمَا یُلَقّٰىہَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ/ وَمَا یُلَقّٰىہَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ/ (۳۵) وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ/ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ/ (۳۶)

۱۱ اور اُس شخص سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہو گی جو (صرف اور صرف) اللہ ہی کی طرف بلائے اور کہے کہ میں تو فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور اچھائی و برائی برابر نہیں ہو سکتیں پس (اے نبی ﷺ) آپ اپنی مدافعت کیجئے ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو، پھر ایک وقت آئے گا کہ جب آپ کے آپکے مخالف کے مابین موجود عداوت ایسی حالت میں بدل جائے گی کہ وہ آپ کا پکا دوست و مددگار بن جائے گا۔ اور یہ مقام و مرتبہ نہیں حاصل کر سکتے مگر وہی لوگ جو ثابت قدم رہنے والے ہیں اور یہ شرف نہیں حاصل کر سکتے مگر وہی لوگ جو انتہائی خوش قسمت ہیں۔ ۱۱ (حم السجدہ ۳۳ ۳۲)
مقام خلافت یقیناً ایک بہت بڑی ذمہ داری کے علاوہ ایک بہت بڑا شرف بھی ہے جو اسی شخص کا مقدر ہو سکتا ہے جو آیات درج بالا کا مصداق ہو۔ صرف یہی نہیں کہ وہ شخص صبر و تحمل اور حسن اخلاق کا مظاہرہ صرف ناموافق حالات میں ہی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو بلکہ وہ اُس وقت بھی اسی کردار کا مظاہرہ کر سکتا ہو جب وہ ایک فاتح و کامران کی حیثیت سے اپنے مخالفین سے مخاطب ہو اور پھر انہیں لاتثریب علیکم الیوم کے رحمدلانہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان سے درگزر فرما سکے جیسا کہ آنحضور ﷺ نے سنت یوسفیؑ پر عمل کرتے ہوئے فتح مکہ کے بعد اپنے مخالفین کو یہی الفاظ ادا کرتے ہوئے معاف فرما دیا تھا۔
مذید برآں مقام نبوت کی طرح مقام خلافت کو ایک وہبی چیز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ خلافت موعود ہے اور اللہ تعالی نے اُن لوگوں سے اس کا وعدہ کر رکھا ہے جو ایمان اور عمل صالح کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچنے کی

کوشش کے ساتھ ساتھ اسکی ہمت بھی رکھتے ہوں جیسا کہ قرآن حکیم کی درج ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ/ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ/ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص/ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ/ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط/ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ط/ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ/ (۵۵)

ا ا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کرلیا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے کہ وہ لازماً انہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسا کہ اس نے اُن لوگوں کو خلافت عطا کی جو ان سے پہلے ہوگزرے اور وہ لازماً اُن کے لئے ان کے اُس دین کو تمکن عطا فرمائے گا جو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اور وہ لازماً انکی موجودہ حالت خوف کو امن میں تبدیل کردے گا، (پھر اُس وقت وہ صرف) میری ہی (کامل) بندگی کریں گے اور میرے ساتھ (عقائد، عبادات اور معاملات وغیرہ میں) کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو کوئی اس کے بعد بھی کفر کی روش ہی اختیار کرے گا تو وہی لوگ (حقیقی) نافرمانوں میں سے ہوں گے۔ا ا (النور ۵۵)

آیت درج بالا کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ دراصل اس میں اُس گروہ کا بیان ہوا ہے جو ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کرے گا (یعنی انکے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنے کی حتیٰ الوسع کوشش کرے گا)۔ جب وہ مقام مطلوب تک پہنچے گا تب ہی بارگاہ ایزدی میں خلافت کا سزاوار بن سکے گا مگر جو لوگ عزیمت کی بجائے مصلحت کی روش اختیار کریں گے اُن کے دنیا کا چار روزہ اقتدار وحکومت تو مقدر ہوسکتی ہے مگر وہ خلافت نہیں جو عنداللہ ابن آدم کے لئے مطلوب ومقصود ہے۔

پس جو رہنما ایک ایسی مطلوبہ جماعت قائم کرلینے میں کامیاب ہوجائے گا اور عنداللہ منصب خلافت کا حقدار بھی قرار پاجائیگا تو اس کے لئے نصرت الٰہی کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے اور اللہ کی اس خصوصی نصرت وتائید سے حالات بھی دن بدن اس کے موافق ہوتے چلے جائیں گے اور بالآخر وہ مرحلہ آن پہنچے گا جب تمام وہ قوتیں جو قبل ازیں اسکی تحریک ودعوت کے خلاف مصروف عمل تھیں، اُس کے تصرف و اختیار میں آجائیں گی جنہیں وہ کمال حکمت سے کام میں لاتے ہوئے رب کی دھرتی پر رب کا نظام (نظام خلافت) قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ انشاءاللہ العزیز

درج بالا تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مہدی کے ظہور سے پہلے نظام خلافت قائم ہوچکا ہوگا اور ان کے پیشرو ایک یا دو خلفاء ہی اُن کے لئے زمین ہموار کریں گے۔ ان پیشرو خلفاء میں سے اول کی جدوجہد قیام خلافت کیلئے اور دوسرے کی اس نظام خلافت کے استحکام کے لئے اقدامات کی نذر ہوجائے گی جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اور انکے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زیادہ تر جدوجہد قیام خلافت اور استحکام خلافت کی نذر ہوئی اور اسلام کا کامل عادلانہ نظام حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں ہی قائم ہوسکا۔ خلافت راشدہ کے دور ثانی میں اسلام کا کامل عادلانہ نظام حضرت مہدی کے دور میں ہی قائم ہوسکے گا۔ روایات میں قیام نظام عدل وقسط کے حوالہ سے حضرت مہدی کا بالخصوص ذکر (راقم کے خیال میں) اسی تناظر میں کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

باقی رہے یہ سوالات کہ حضرت مہدی کے پیش رو خلیفہ یا خلفاء کا نام اور قیام خلافت کی صراحت روایات میں کیوں نہیں کی گی ہے تو جواب اسکا یہ ہے کہ یہی تو دراصل ذریت آدم میں سے خیر اُمت کہلانے والی اُمت محمد ﷺ کا بالعموم اور اس اُمت کے اندر خدمت دین کے حوالہ سے سرگرم عمل دینی قوتوں کا بالخصوص امتحان ہے کہ آیا وہ اُمت کے وسیع ترین مفاد کی خاطر مرکزیت یا بالفاظ دیگر خلافت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے، اپنی اپنی انا کو قربان کرتے ہوئے اور اپنے اپنے ذاتی وطبقاتی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک موزوں ترین شخص کو اپنا امیر مقرر کرکے اسکی قیادت میں متحد ہوتے ہیں یا نہیں؟ اس حقیقت سے تو سبھی بخوبی واقف ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی وفات کے بعد خلافت راشدہ کے قیام کی صرف خبر ہی دی تھی حالانکہ آپ ﷺ اپنے جانثار صحابہ کرامؓ کو بالترتیب اپنے خلفاء کے نام اور یا پھر انکے انتخاب کا ایک محفوظ طریقہ کار بھی بتا سکتے تھے۔ اگر آپ ﷺ نے ایسا کیا ہوتا تو روافض اور خوارج کے فرقے وجود میں آتے اور نہ ہی حضرات صحابہ کرامؓ کے مابین اختلافات کی نوبت آتی۔ یقیناً یہ سب کچھ امتحان تھا اور انہوں نے ان تمام امتحانات میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ صحابہ کرامؓ کی طرح نظام خلافت کو قائم کرنا اُمتیوں کا امتحان ہے اور یقیناً وہ اس میں بالآخر کامیاب بھی ہوں گے لیکن یہ حقیقت ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ یہ کام محض معجزات وکرامات کے ذریعے نہیں بلکہ انسانی کاوشوں کے ذریعے ہی ممکن ہوسکے گا۔ نبی کریم ﷺ نے آخری زمانہ کے جس گروہ کو حضرات صحابہ کرامؓ کا سا اجر وثواب ملنے کی خوشخبری دی ہے، وہ یقیناً وہی گروہ ہوگا جو حضرات صحابہ کی طرح ایمان کے تقاضے پورا کرے گا اور انہی کی طرح دین اللہ کا انصار بن کر نظام خلافت کے قیام کی نہ صرف جدوجہد کریگا بلکہ اس میں اہم ترین عملی کردار بھی ادا کرے گا۔

حضرت مہدی کے پیشرو خلفاء کے نام اور قیام خلافت کے مرحلہ کی تفاصیل نہ بیان کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اقامت دین اور قیام خلافت کے اس اہم ترین مرحلہ کو محفوظ ومامون طریقہ سے پایہء تکمیل تک پہنچانے کا بھی تقاضہ یہی تھا کہ اس مرحلہ کی زیادہ تفاصیل بیان نہ کی جائیں۔ واللہ اعلم بالصواب